قانون سازی کے ذریعہ عمرانی اصلاحات

نفضل حمید

عمرانی فلاح کے لئے قانون سازی جس حد تک کہ معقول اور عمرانی ضمیر کے تقاضوں کے موافق ہے' قوم کے لئے مفید ہے۔ لیکن سماجی اصلاح کے قوانین اس وقت تک مفید نہیں ہوسکتے جب تک کہ ان کی ضرورت کا احساس معاشرہ میں پیدا نہ ہو۔ اور لوگوں کی مرضی ان پر کاربند ہونے کی نہ ہو۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ عمرانی فلاح کے لئے لوگوں کے اجتماعی ذہن میں صحیح اذعان و قبولیت پیدا کریں۔ اگر عمرانی ضمیر قوانین کی پشت پر نہ ہو تو رفتہ رفتہ وہ بے اثر اور مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یا تو لوگوں کی طرف سے ان قوانین کی مزاحمت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

محتسب گر خُم شکند من سرش را بشکنم

یا پھر ثمرِ ممنوعہ کی رغبت تیز تر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ۔

اَلاِنسَانُ حَرِیصٌ عَلیٰ مَا مُنِعَ

مژدہ اے مستاں کہ سنگ از محتسب برسر ما آمد از مینا گذشت

جس طرح کہ لوگوں کو لاٹھی مار کر اچھا نہیں بنایا جاسکتا اسی طرح محض قوانین و ضوابط کے نفاذ سے وہ نیک نہیں بن سکتے۔ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ ایک بد دیانت معاشرے میں قواعد و ضوابط کی کثرت ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تعلیمی و تبلیغی ادارے سماجی بہبود کے لئے لازمی ہوتے ہیں۔ جائے حسرت و افسوس ہے کہ ہم میں رضاکارانہ طور پر معاشرتی فلاح کے لئے کام کرنے والوں کا تقریباً مکمل فقدان ہے۔ اس لئے یہ لوازم میں سے ہے کہ لوگوں میں فلاح و اصلاح کی تحریک چلانے کا شعور و احساس پیدا کیا جائے۔

بُری رسوم کی بیخ کنی کے سلسلے میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کوئی رسم، دستور، یا رواج، ابتداءً اور فی الاصل بُرا نہ تھا۔ اس سے ان زمانوں میں جب یہ مروج ہوا، کوئی نہ کوئی سماجی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ بے شک عمرانی وتاریخی ارتقاء کے اعتبار سے ہر رواج اضافی حیثیت سے اچھا تھا۔ بات یہ ہے کہ کوئی بھی رواج ہو وہ لوگوں کی اجتماعی مرضی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس کا ظہور ان کے طرزِ عمل میں ایک مسلسل اور پائدار مقام حاصل کر لیتا ہے۔ خلل دراصل عمرانی ضمیر یا سماجی طرزِ عمل کے اعتبارات میں واقع ہوتا ہے نہ کہ خود رواج میں۔ عمرانی جسم نامی یا تنظیم اسے جو بھی آپ نام دیں، نشوونما پذیر ہوتی ہے۔ عمرانی نظم ونسق یا ترقی کرتا ہے یا تنزل۔ یہ کبھی ساکن وجامد نہیں رہتا۔ یہ آگے بڑھتا ہے یا پیچھے ہٹتا ہے۔ بقول غالب

در ہر مژہ برہم زدن این خلق جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است وہماں نیست

خرابی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ رسوم ورواج اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔ اور بدنما ہو جانے کے بعد بھی قائم رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ بچپن کی شادی۔ یہ ایک قسم کا سماجی بیمہ تھا۔

ایک ایسے دور میں جب لڑکیاں اپنے حقوق ومفادات کا تحفظ کرنے سے قاصر تھیں اور ایک باپ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی زندگی کے سال اب زیادہ باقی نہیں رہتے۔ باپ کے ان تشویشناک جذبات کا اندازہ زمانہ جاہلیت کے ایک عربی شاعر کے ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔

لولا امیمۃ لم اجزع من العدم   ولم اقاس الدجیٰ فی حندس الظلم
وزادنی رغبۃٌ فی العیش معرفتی   ذل الیتیمۃ یجفوہا ذوو الرحم
تہوی حیاتی واہوی موتہا شفقا   والموت اکرمُ نزّالٍ علی الحرم

اگر امیمہ نہ ہوتی تو میں ناداری کی فریاد نہ کرتا اور رات کے اندھیروں میں دشت نوردی نہ کرتا میری زندگی کی خواہش اس معرفت کی وجہ سے زیادہ ہو گئی ہے کہ اس میں یتیمہ کی ذلت ہوگی اور اقربا اس پر جفا کریں گے۔ وہ میری زندگی کی تمنا کرتی ہے اور میں ازراہِ شفقت اس کی موت کی تمنا کرتا ہوں۔ اور موت عورتوں پر نازل ہونے والی چیزوں میں مکرّم ترین ہے۔

لیکن اب یہ رسم بے کار، متروک اور ضرر رساں ہو گئی ہے۔

۲- برادری یا قبیلہ۔ یہ سماجی تحفظ کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ تاریخ کے ایسے دور میں جب مکمل قانونی حفاظت لوگوں کو میسّر نہ تھی اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون نافذ العمل تھا۔ اس دور میں یہ بجا طور پر کہا گیا تھا۔

"جیاں دی جے اے"

(جن کے جی (افراد) زیادہ ہیں، انہیں کی جے ہے)

برادری کا دستور سماجی مساوات اور تعاون کا بھی ضامن تھا۔ کسی کو خواہ وہ کتنا ہی مالدار یا ذی اقتدار کیوں نہ ہو، برادری کے فیصلوں سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ اب یہ رواج اپنی افادیت کھو چکا ہے اور زمان و مکان کے اعتبار سے اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔

۳- نیوتہ۔ دوست و عزیز جو شادی کے موقع پر تحفے، سلامیاں اور نذرانے دیتے تھے وہ اشتراک باہمی کے اصول کے مطابق ایک ضروری عمل تھا۔ اب اس کی افادیت میں کافی کمی واقع ہو گئی ہے

۴- نذرانے اور چڑھاوے۔ ختم، نیاز اور فاتحہ قطع نظر ان کے مالہٗ و ماعلیہ کے جس پر بحث کرنا یہاں مناسب نہیں امراء کو اس بات پر مجبور کرنے کا کہ وہ غرباء و مساکین کو خیرات دیں، واحد ذریعہ تھا کیونکہ ان کے عقیدے میں فوت شدہ والدین یا اہل و عیال کی ارواح کو اس کے بغیر ایصال ثواب ممکن نہ تھا۔ ان رسوم اور پڑھاووں کی افادیت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ غور کیا جائے کہ قدیم زمانے میں روپیہ کتنا کمیاب تھا۔ اس کی گردش کتنی کم تھی۔ اور ملازمت اور روزگار کے سوا قع بجز فوج کی ملازمت کے تقریباً مفقود یا بہت ہی محدود تھے۔ نہ بڑے بڑے کارخانے تھے نہ ایسی صنعتیں تھیں جن کے ذریعہ آدمی محنت کر کے اپنی روزی کما سکے۔

۵- آج کل خانقاہیں عمرانی اعتبار سے چنداں مفید معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن پرانے زمانے میں یہ علوم و فضائل کی درس گاہیں اور روحانی ترقی کی تربیت گاہیں تھیں اور غریبوں اور محتاجوں کے لیے ادارات خیریہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہاں غریبوں کو لنگر مفت تقسیم ہوتا تھا۔ اور بزرگان کرام مسند رشد و ہدایت پر بیٹھ کر امراء اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے بارے میں فریادیں سنتے تھے اور اپنی روحانی توجہ یا ہمت سے اور بعض اوقات تہدید و تنبیہ سے ان کی حق رسی کرا دیتے تھے۔

۶- شادی کی شاندار رسومات اور عقیقہ و ختنہ وغیرہ کی تقریبات اونچے درجے کی خواتین کی

تفریح خاطر اور دلچسپی کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔ حرم کی چاردیواری کے اندر ان خواتین کی زندگی ایک قسم کی قید تھی ایسی تقریبات سے ان کے ہاں رونق گہما گہمی چہل پہل اور رقص و سرود کی محفلوں کی گرما گرمی ہو جاتی اور انہیں زندگی کی اکتا دینے والی یک رنگی ویکسانیت سے نجات مل جاتی تھی۔ حاجت مندوں کو بھی ایسے موقعوں پر کافی خیرات مل جایا کرتی تھی۔

اب چند مذموم رسوم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ملک کے بعض حصوں میں یہ دستور ہے کہ لڑکی کے والدین سے گراں قدر جہیز طلب کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے بعض حصوں میں اس کے بالعکس صورت پائی جاتی ہے۔ اور دولہا یا اس کے والدین لڑکی کے باپ کو گراں قدر معاوضہ دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے یا تو اناث کی تعداد ذکور سے زیادہ ہے۔ یا اس کے برعکس ذکور زیادہ ہیں اور اناث کم۔ یہ رواج بہرحال کوتاہ نظری پر مبنی ہے۔ اگر دور بینی سے کام لیا جائے تو اس میں سب کا نقصان ہے۔ کیونکہ آدمی ایک ہاتھ سے جو کچھ حاصل کرتا ہے، وہ دوسرے ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔ اور اس سے مجموعی طور پر معاشرتی نقصان ہوتا ہے۔ اگر یہ سادہ وصاف حقیقت مسلسل طور پر لوگوں کو کچھ مدت تک سمجھائی جاتی رہے تو لامحالہ انہیں اس رسم کی قباحت کا احساس ہو جائے گا۔ اس بری رسم کو دور کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ رشتہ دینے لینے کے لئے تعلیم، سیرت و کردار اور ذاتی خوبیاں محک ردو قبول ہیں نہ کہ مال وجہیز۔

آج کل قتل کی وارداتوں میں بڑا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں ان کے اسباب کا تجزیہ مقصود نہیں البتہ ان کے علاج کی ایک تجویز پیش کی جاتی ہے۔

اسلام میں انسانی زندگی کی بہت بڑی حرمت ہے۔ انسان کے نفسِ محترمہ کو حرمت الٰہی کا اعتبار دیا گیا ہے اسلامی قانون کی رو سے انسان کی جان بغیر حق (یعنی بجز حفاظتِ خود اختیاری کی لازمی صورت کے، یا ملک کی آزادی کی ناگزیر مدافعت میں یا بطورِ قصاص کے عدالت کے فیصلے کے ماتحت) لینا ناقابل عفو گناہِ کبیرہ ہے اسلامی تصوف نے انسانی شخصیت کو تشخصِ الٰہی کا مرتبہ دیا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است   از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

کعبہ بنگاہِ خلیل آذر است   دل گزرگاہِ جلیل اکبر است

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس بارے میں ایسی بات کہی ہے جو انسانی شخصیت کو خدا کے ساتھ اگر عینیت کا نہیں تو اقربیت و معیت کا شرف ضرور بخشتی ہے اور کسی مسلمان کے لئے

خدا کو ناراض کئے بغیر کسی دوسرے انسان کو اذیت پہنچانا ناقابل تصور ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

ہم اس کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہیں

وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ

ہم نے اپنی روح اس میں پھونک دی ہے

اسلامی تصوف کا حقوقِ آدمیت کی عصمت و احترام پر یہ بہت سے بڑا احسان ہے۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ قرآن پاک کی رُو سے قتل کی سزا عالمِ آخرت میں وہی ہے جو بت پرستی یا شرک کی ہے۔ اس نکتہ کو لوگ صحیح طور پر نہیں سمجھتے ورنہ کوئی مسلمان جو خدا سے ڈرتا ہے اور یوم الحساب میں یقین رکھتا ہے کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ وہ خون ناحق یا قتلِ عمد کا مرتکب ہوگا۔ جسے خدا اپنی بادشاہی کے خلاف بغاوت کا مترادف قرار دیتا ہے۔ توحید کا اسلامی تصور شخصیت کے دو پہلوؤں پر زیادہ زور دیتا ہے۔ آدمی کی حقیقی یا باطنی خودی شہودیوں کے نزدیک عکس و ظلِ حق سبحانہٗ تعالےٰ ہے۔ اور وجودیوں کے نزدیک عین الحق ہے۔ اسی بنا پر ان کے نزدیک تمام عالم انسانیت ایک وحدتِ مطلقہ کا مظہر ہے۔ روحِ حق جو تمام انسانوں میں پھونکی جاتی ہے ایک نورِ بسیط ہے اور اس لئے باوجود تعین و تقید افرادی کے تقسیم و انفکاک قبول نہیں کرتی۔ اس وحدتِ روحی کی بنا پر عام انسانیت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔

سرقہ۔ یہاں سرقہ کی عام اقسام سے بحث نہیں، میرا روئے سخن شعرائے متغلبین اور پیشہ ور علمی و ادبی سارقوں کی طرف ہے جب وہی ہے یعنی دوسروں کے مال پر تصرف کرکے اپنے آپ کو مالدار بنانا۔ اس میں زیادہ خرابی کی بات یہ ہے کہ مال اور روپے کی چوری قابلِ تعزیر ہے لیکن دماغی سرقہ ہوشیاری اور زیرکی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس مخالفِ عمرانیت حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں وہ دوسروں کی تحریروں یا اشعار کو جزئی یا کلی طور پر اپنا ظاہر کرکے روپیہ کماتے ہیں۔ چوری کا مال دینے والوں سے وہ لوگ جو یہ مالِ مسروقہ قبول کرتے ہیں بہتر نہیں۔ یہ طرزِ عمل جہاں مصنفین کے حقوق پر دست اندازی کرتا ہے وہاں قوم کی علمی و ذہنی دیانت اور فنی قوتِ تخلیق کے ضیاع یا زیاں کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس طرح بدیع و

جدید افکار کے انتشار کی قابلیت ناقابلِ تلافی طور پر مضمحل ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی اپنے مخصوص انداز میں یوں کی ہے۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

غالب نے اسی مضمون کو مزاحیہ طرز میں ادا کیا ہے۔

مضمونِ شعر نوٹ بود فی زماننا
یعنی بہ دست ہر کہ بیفتاد آنِ اوست

بلاشبہ دوسروں کے خیالات سے استفادہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ علمی سرمایہ کی ترتیب و جمع میں عملِ اتحاد و اکتساب کا پایا جانا لازمی ہے۔ جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ مشعلِ علم ہمارے حوالے کر گئے ہیں۔ اور جیسا کہ کہتے ہیں کہ ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہوتی ہے اسے نقل یا ادبی سرقہ نہیں کہتے لیکن دوسروں کے خیالات کو اپنا ظاہر کرنا اور ماخذ کا حوالہ نہ دینا نامناسب ہے۔ خیالات اکثر ماخوذ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو بجنسہٖ دوسروں کی تصنیفات میں سے اٹھا کر اپنی کتاب یا مقالے میں رکھ دینا اور ماخذ کا نام تک نہ لینا ظلم ہے۔

ان دونوں میں ایک لطیف امتیاز ہے۔ بقولِ شاعر

مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد!

رشوت ستانی اور خیانت کے زیادہ تر دو سبب ہیں، جن کی وجہ سے ان کا بازار گرم ہے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے وسائل آمدنی سے زیادہ حیثیت سے رہتے سہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ بنگلہ۔ بنک بیلنس۔ اور موٹر کار انفرادی عزت و تفاخر کے قابلِ فخر نشان ہیں۔ یہ عمرانی شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بددیانتی سے کمائی ہوئی دولت کی یہ ظاہری علامتیں عزتِ نفس کے منافی ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ آمدنیوں کی شرح میزان افراطِ زر کی حریف نہیں۔ اور ضروریاتِ زندگی اور آمدنی کے پلڑے برابر نہیں رہ سکتے۔ ایک اور سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے جائز و ناجائز مقاصد کے لئے رشوت پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہمیں لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنا چاہیئے کہ راشی و مرتشی دونوں مساوی طور پر مستحقِ ملامت ہیں۔

کثرتِ آبادی کو عمرانی خرابیوں میں شمار کرنا اصلاً صحیح نہیں کیونکہ توالد و تناسل کی زیادتی بذاتِ خود کوئی خرابی نہیں لیکن میرے خیال میں کثرتِ آبادی جدید علوم پر ایک ایسے تمدن کی پیداوار ہے جس میں حظوظِ نفسانی کی ترغیب اور سفلی محرکات زیادہ ہوتے ہیں۔ میں تمدنِ حظِ نفسی کی تعریف یہ کروں گا کہ وہ ایک ایسا تمدن ہے جو آدمی کی ساعی کو حیوانی ضرورتوں اور تحریکوں کی اعانت تک محدود رکھتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک جنسی خواہش آدمی کی تمام خواہشات اور جذباتی واردات کی اصل الاصول ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف کئے بغیر یہ معقولیت سے کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی جملہ خوبیاں جو ہمارے سامنے انسانی تصوراتِ جمال و کمال کے مظاہر میں متمثل ہوتی ہیں، انسانی جبلتوں اور محرکات کی تحسین و تعالی پر منحصر ہیں۔ توازن و توافق پذیری آدمی کی خواہشاتِ نفسانی اور مقتضیاتِ روحانی کے درمیان ایک خطِ اعتدال کھینچنے پر موقوف ہے۔ اسی ہم آہنگی پر انسان کے جمال و کمال کا دارومدار ہے۔ نفسانیت انگیز تمدن جو اخلاقی تصوریت، روحانی عینیت اور جمالیاتی شعور سے بے بہرہ ہوتا ہے، جنسی خواہش کی ہیجانی کیفیات کی دارگیر میں مبتلا رہتا ہے۔ مثالی و عینی تمدن میں ارتفاقاتِ انسانیہ کو بروئے کار لانے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں تاکہ جسمانی خواہشیں روحانی تقاضے اور خالص علمی عوامل آپس میں مل کر موافق و مطابق ہوجائیں۔ اس ہم آہنگی و ارتباط باہمی سے معاشرہ کے مزاج میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہوجاتا ہے اور بالغوں کی جنسی خواہش دیر میں بیدار ہوتی اور معقولیت کے دائرہ میں رہتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو انسانی خودی کے حیوانی، انسانی اور الٰہی تقاضوں میں ہم آہنگی و اعتدال قائم رکھتا ہے، مقابلتہً کثرتِ آبادی کی آفت سے بچا رہتا ہے۔ کیونکہ اس میں جنسی تعلقات اپنے اعتدالی مزاج سے باہر نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف نفسانی خواہشات کو آب و تاب دینے والا تمدن اپنی خواہش کے اسپِ بادرفتار کو بگٹٹ چھوڑ دیتا ہے۔ اور یہ مضمون ہوتا ہے کہ۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

حب الوطنی یعنی ملک سے اس اعتبار سے محبت کہ وہ ایک سیاسی وحدت ہے، آخری تجزیے میں نتیجہ ہے ذاتی شعور اور شکرگزاری کا۔ یعنی فرد ان راحتوں، آسودگیوں، بنیادی حقوق، آزادیوں اور رعائتوں کے لئے جو اسے اپنے ملک میں حاصل ہوتی ہیں۔ منت گزار ہوتا ہے اور سیاسی وحدت کو جسے ملک سے تعبیر کیا جاتا ہے مرجع عقیدت و احترام قرار دیتا ہے۔ حب الوطنی کی نشوونما کے لئے

صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں وعظ و تذکیر سے زیادہ عمل کے ذریعہ تبلیغ کی جائے۔ اربابِ اقتدار یا قوم کے رہنماؤں کا یہ فرض ہے کہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں سماجی انصاف، دولت کی معدلت پر دور تقسیم اور بہ شرطِ قابلیت و حسبِ استعداد سب کے لئے مساوی مواقع بہم پہنچنے کا باقاعدہ انتظام ہو۔ وہ صاحبِ اختیار جو کسی کی عرضی پڑھنا پسند نہیں کرتا، جو معروضات کو سننا گوارا نہیں کرتا اور شکایات کا ازالہ کرنا بارِ خاطر سمجھتا ہے جو حق و ناحق کے امتیاز سے غافل ہے جو عوام کے دکھ درد سے بے نیاز رہتا ہے۔ جو جائز نکتہ چینی کو برداشت نہیں کرسکتا وہ ضابط پرست حاکم جو مغرور رہے اور تکبرانہ انداز سے پیش آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر جو اپنے مریضوں سے بے دردی کا سلوک کرتا ہے۔ سب کے سب غیر حب الوطنی کے معین و مددگار ہیں میرے خیال میں حب الوطنی وہ عوض یا معاوضہ ہے جو کوئی شہری اپنی انفرادی حیثیت میں ان مشترک فائدوں، راحتوں اور آسودگیوں کے لئے ذہنی طور پر ادا کرتا ہے یہ احساس بہ قدرِ شعور ان سے استفادہ ہوتا ہے۔ اور استفادہ کا انحصار اربابِ حل و عقد کے طرزِ عمل اور اندازِ فیض رسائی پر ہوتا ہے۔ غرضکہ عمرانی اصلاح حقیقتاً ضبطِ نفس اور ضبطِ خیال کا مسئلہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ **فقد افلح من زکّاہا** جس نے اس (نفس) کا تزکیہ کیا اس نے فلاح پائی۔

انفرادی و اجتماعی طرزِ عمل کے اعتبارات سے انسانیت پرور جذبۂ الفت و ہمدردی بڑی اہمیت اور وقعت کا حامل ہے۔ صلاح و فلاح یہ ہے کہ اپنے نہاں خانۂ ضمیر میں دوسروں کی راحت و آسودگی کو کم از کم اپنی راحت و آسودگی کے برابر جگہ دی جائے۔ اس سلسلے میں چند صوفی شعراء کے اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں جن کی روحانی لطافت اور معنوی بلاغت مستغنی عن التعریف ہے۔

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن — کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

ہزار کنج عبادت ہزار گنج کرم — ہزار طاعتِ شب ہا، ہزار بیداری
ہزار روزۂ تسبیح و صد ہزار نماز — قبول نیست اگر خاطرے بیازاری

آخر میں نظیری نیشاپوری کی یہ موعظت سنئے۔

نظیری گر طمع داری کہ مقبول مغاں باشی — فلا تحسد ولا تبخل ولا تحرص علی الدنیا

یعنی نہ حسد کرو نہ بخل کرو اور نہ دنیا طلبی کی حرص کو حد سے بڑھنے دو۔